OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں اسلامی تہذیب اور ہزارہ ثقافت کا عکس: "جاگے ہیں خواب میں" اور "جندر" کا اختصاصی مطالعہ

Reflection of Islamic Civilization and Hazara Culture in Akhtar Raza Saleemi's Novels: A Study of "*Jāgy hein Khawāb Mein*" and "*Jandar*"

Dr. Jindwada Ayaz
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College, Baghdad Road, Bahawalpur

Abstract

Akhtar Raza Salimi's novels "Jage Hain Khwab Mein" and "Jander" are mirror of the cultural phenomena born from the establishment of the Islamic Empire of Syed Ahmad Shaheed in the mountain ranges of Punjab and Khyber Pakhtunkhwa and the Hazara Valley and the Mujahideen's resistance to the British and the Sikhs. These novels describe the existential crisis and the importance of the characters and events in terms of symbolism. By showing the components of the decaying civilization and struggling with the oppression of the industrial era, Akhtar Raza Salimi has highlighted the freedom of human temperament and the freedom of personal choice. He presents in an allegorical way that the industrial era prevented man from living as a free creature.

Key Words: Akhtar Raza Saleemi, *Jāgy hein Khawāb Mein, Jandar,* Islamic Civilization, Hazara Culture

تمہید

اختر رضا سلیمی کے ناول "جاگے ہیں خواب میں" اور "جندر" پنجاب اور خیبر پختونخواہ کے پہاڑی سلسلے اور ہزارہ وادی میں سید احمد شہید کے اسلامی سلطنت کے قیام اور مجاہدین کی انگریزوں اور سکھوں کے خلاف مزاحمت سے جنم لینے والے ثقافتی مظاہر

CC BY

کے آئینہ دار ہیں۔ یہ ناول وجودی کرب کو بیان کرتے ہیں اور علامتی حوالے سے ان ناولوں کے کرداروں اور واقعات کی اہمیت بہت توجہ طلب ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیب کے اجزا کو صنعتی عہد کے جبر سے نبرد آزما دکھا کر اختر رضا سلیمی نے انسانی مزاج کی آزادی اور شخصی پسند اور انتخاب کی آزادی کو تمثیلی انداز میں اجاگر کیا ہے کہ صنعتی عہد نے انسان کو آزاد مخلوق کی طرح جینے سے روکا ہے اور شیر کی طرح ہانکا لگا کر اس وحشی کو زیرِ دام کیا ہے۔

ناول اور سماج

ناول اپنی صنف کے تہذیبی اجزا میں جس حقیقت کو خیالی واقعات کی بیان آوری سے آمیخت کرتا ہے وہ انسانی سماج کی گونا گوں نیرنگیوں اور حیرتوں کے جہان قارئین و ناقدین اور محققین کے لیے وا کیے رکھتی ہے۔ یہ حقیقت جو مصنف کے تصورِ کائنات کا حصہ بن کے بیان کی جانے والی زبان اور اس کی عصبیتوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے جہاں وہ ایک طبقۂ انسانی کے لیے مصدقہ حقائق سے تعلق رکھتی ہے وہیں کئی انسانی طبقات کے لیے وہ حقائق نہیں بلکہ ایک تسلیم نہ کیے جانے والا نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں۔ مصنف اپنے واقعات اور کرداروں کے ذریعے سے ایک دنیا کی تشکیل کرتا ہے۔ کردار، واقعات، مناظر اور پلاٹ سب اپنی نئی دنیا کی تشکیل کرتے ہیں جو ہر ناول اور مصنف کے رجحانات و میلانات کو زبان و ادب کا حصہ بناتے ہیں۔ انسانی سماج کے مسائل سے تعلق رکھنے والی یہ صنفِ ادب اپنے لوازمات میں تہہ داری اور کثیر المعنویت کی حامل ہے۔ ناول کے اجزا میں سب سے اہمیت کا حامل جزو کردار نگاری ہے جس کے ذریعے سے مصنف کسی مخصوص زمانے اور علاقے کی زندگی کو قارئین کے لیے پیش کرتا ہے۔ یہ کردار جہاں حقیقت سے متصل ہوتے ہیں وہیں ان میں شخصیات، واقعات اور تاریخ و سیاست سے مطابقت ایک ایمائی پہلو بھی لے آتی ہے جو اپنی اصل میں علامت سے علاقہ رکھتی ہے۔ ناول نگار اپنے ناول کے پلاٹ کی طرح عموماً کرداروں پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں جو زندگی اور واقعات میں تحرک کا باعث بنتے ہیں اور اپنے مزاج کی بدولت واقعات کو نئے موڑ دیتے ہیں۔ کرداروں کی تشکیل ناول نگار کی فن پر دسترس اور کمالِ فن کی عکاس ٹھہرتی ہے۔ ان کرداروں کے مکالمے ذات کے دروں خانوں کی خبر لاتے ہیں۔ یہی بعد میں ناقدین و محققین کے لیے جدید تھیوریوں کے ذریعے فن پارے کی تفہیم میں جدیدیت، علامت، وجودیت، مابعد جدیدیت اور مابعد نو آبادیاتی مطالعوں کی کلید بنتے ہیں۔ یہ ناول (جاگے ہیں خواب میں) اپنے اسلوب میں سرزمینِ ہزارہ کی تاریخ، ثقافت، تہذیبی ورثہ، تمدنی رنگ، حسنِ فطرت، حسنِ سیرت، انسان کی سخاوت و شقاوت کا بیان، مسجع کلام، بے لاگ تنقید، منظر نگاری، جذبات کی ترجمانی اور سبق آموز باتوں کی ایسی امثال رکھتا ہے جس نے اسے اپنے عہد کے معاصر ناولوں میں ایک قابلِ ذکر حیثیت عطا کر دی ہے۔[1] (فاضل محقق۔ نثار ترابی۔ نے اپنے آرٹیکل میں دانیال طریر کی کتاب سے آٹھویں اور آخری حوالے کا صفحہ نمبر 193 درج کیا ہے جو دراصل صفحہ 204 پر درج ہے کیونکہ اس کتاب کا تاحال ایک ہی ایڈیشن سامنے آیا ہے اس لیے ایسے تسامحات کی تصحیح ضروری ہے۔)

اختر رضا سلیمی کا تخلیقی سفر

ناول نگار کی مہارت، بصیرت، بصارت، مشاہدات و تجربات اور واقعات سے استخراجِ نتائج یہ تمام اوصاف ہمیں اردو ناول کی تاریخ اور روایت میں تلاش کرنے کے سفر میں جن دانش ور مصنفین سے سابقہ پڑتا ہے ان کا سلسلہ ابتدا سے لے کر تاحال پھیلا ہوا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اہم نام اختر رضا سلیمی ہے جنھوں نے بہت کم عرصے میں اپنی قابلیت کی دھاک ادبی دنیا پر بٹھا دی ہے۔ اب تک ان کے دو ناول منصۂ شہود پر آ کے اردو دان طبقے میں ناقدین کی ایک بڑی تعداد سے دادِ تحسین وصول کر چکے

ہیں۔ ان کے متعدد شعری مجموعے بھی سامنے آئے۔ 2003ء میں غزلوں کا پہلا مجموعہ "اختراع" شایع ہوا اور پانچ برس کے بعد غزلیات ہی کا دوسرا مجموعہ "ارتفاع" 2008ء میں سامنے آیا۔ غزلیات کے ان مجموعوں پر مشتمل کلیاتِ غزل "خوشبو مرے ساتھ چل پڑی" 2009ء میں چھپی اور نظموں کا پہلا مجموعہ "خواب دان" کے عنوان تلے 2013ء میں شائع ہوا تھا۔ شاعری کی دونوں اہم اصناف غزل اور نظم کے بعد وہ نثر کے میدان میں سامنے آئے اور 2015ء میں ان کا پہلا ناول "جاگے ہیں خواب میں" اور 2017ء میں دوسرا ناول "جندر" زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ جندر کو فکشن کے یو بی ایل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اختر رضا سلیمی کا جنم مارگلہ کی پہاڑیوں کے شمالی سمت ضلع ہری پور کے ایک گاؤں کیکوٹ میں ہوا جس کی بنیاد انھی کے جدِ امجد نور خان نے عبداللہ خان کے ساتھ مل کر 1832ء سے 1834ء میں رکھی۔[2]

سید احمد شہید کے جہاد کی متوازی تاریخ

اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں اسی علاقے کے پہاڑ، مناظر، درخت، رہن سہن اور تہذیب و ثقافت اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ ناول نگار نے اپنے ان دو ناولوں میں جہاں ہزارہ وادی کی تہذیب پر اسلامی ثقافت کے اثرات کو سمویا ہے وہیں ان ناولوں میں وہ اس خطے میں انگریزوں اور سکھوں کے خلاف برپا ہونے والے معرکے کے نقوش کا اب تک اس علاقے اور اس کے لوگوں پر ان منٹ نقش بھی پیش کرتے ہیں: ناول کے مرکزی وقوعے کا تعلق سید احمد شہید کے سکھوں کے خلاف ایک باغی جتھے کے دو نوجوان مجاہدین (جو آپس میں بھائی بھی ہیں) کی جرات اور بہادری کے ساتھ ہے کہ جو اپنے مذہبی پیشوا کی شہادت کا انتقام بڑی دلیری کے ساتھ ایک سکھ سورما سے لیتے ہیں۔ اپنی ہمت اور کردار کی عظمت کے باعث ایک نئی بستی نور آباد کی بنیاد رکھتے ہیں، سکھوں کی پنجاب میں کمر توڑنے میں ان مجاہدین نے چوں کہ بڑی شجاعت دکھائی تھی، اسی لیے بعد میں انگریزوں کی آشیر باد کے باعث جلد ہی اپنے علاقے کے سردار بن گئے۔ انہی کی ساتویں نسل میں زمان جنم لیتا ہے۔[3] ناول نگار اپنی تخلیقات میں جہاں سماج کی مختلف تصاویر کو پیش کرتا ہے وہیں اس کی اپنی ذات اور آپ بیتی کے عناصر بھی شعوری یا لاشعوری طور پر اس کا حصہ بنتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں کے لیے جس زمان و مکان کا انتخاب کیا وہ ان کا بسر کیا ہوا علاقہ اور وقت ہے لیکن ایک تخلیق کار جو بہت طاقت ور متخیلہ کا مالک ہوتا ہے اس کی طرح وہ ان زمانوں میں بھی خود کو بسر کرتا ہوا محسوس کرتے ہیں جس کی کہانیاں بچپن سے اس کے حافظے کا حصہ بنتی ہیں۔ ہزارہ قبائل اور اس خطے کے لیے اعزاز کی بات وہاں جنگِ آزادی کے سلسلے میں انگریزی استعمار اور نو آباد کار کے خلاف اس بے مثال جدوجہد سے عبارت ہے جیسی مثال تاریخ میں نایاب ہے۔ سید احمد بریلوی، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے جانثار ساتھیوں کی طرف سے اسلامی سلطنت یا خلافت کے قیام کی کوشش اور سکھوں کے خلاف جہاد کی داستانیں اس خطے کے لوک حافظے کا حصہ ہے۔ ناول نگار کے اپنے آباء و اجداد اس جنگ میں سپہ گری کے جوہر دکھا چکے تھے اس لیے ان کی کہانیاں نسل در نسل سنائی جاتی رہی ہوں گی جو ناول نگار کے متخیلہ میں "ایک ہزار، ایک داستان" جیسی تخیل و تحیر کے در وا کرتی مسلسل کہانی کا روپ دھارتی چلی گئی ہو گی۔ اسی لیے جب اس نے اپنے ناول کے کرداروں اور واقعات کو بناتو اس بنت میں عصرِ حاضر کے ساتھ ساتھ وہ ان دنیاؤں میں بھی آنکھ کھولتا ہے جہاں اس کے آبا شمشیر کے زور پر اپنے حق کی حفاظت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں کا پنجاب، کشمیر اور اس خطے میں سامنا کرنے والے یہ سورما دیومالائی قوت کے مالک دکھائی دیتے ہیں جو پہاڑوں کے سنگِ گراں کو کاندھوں پہ لادے دریاؤں کے رخ بدلتے دکھائی دیتے ہیں:

"نور خان (اختر رضا سلیمی کے جدِ امجد) اس قبیلے (کرڑال) کا فرد تھا جس نے 1831ء میں معرکہ بالا کوٹ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ماتحت ہزارہ کے سکھ حکمرانوں کے خلاف سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کا ساتھ دیا تھا۔ اس قبیلے نے جنگ جیتنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی لیکن میدانِ جنگ میں سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد انھیں شکست قبول کرنا پڑی۔"[4]

ناول کی تکنیک اور وقت میں سفر کی خواہش

اختر رضا سلیمی اپنے پہلے ناول میں وقت میں سفر کرنے کی تکنیک کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کے منظرِ عام پر آنے والے دونوں ناول "جاگے ہیں خواب میں" اور "جندر" جدید تھیوری کے مباحث اور سائنس سے آگاہ ادیب کے قلم کا شاہکار ہونے کا بین ثبوت ہیں۔ "جاگے ہیں خواب میں" کے اندر طبیعات کے نظریات اور وقت میں سفر کے حوالے سے بحث موجود ہے۔ ناول کے مرکزی کردار زمان کے ذریعے ناول نگار نے وقت میں فرد کے سفر کو دکھا کے نسل در نسل وقوع پذیر ہونے والے حادثات و واقعات کا اجتماعی یادداشت کا حصہ بن جانے کا منفرد خیال پیش کیا ہے۔ زمان اپنے دادا کے زمانے میں سید احمد شہید کے وقت کی جنگ کا حصہ بھی بنتا ہے اور مہاتما بدھ کے عہد میں اشوک کے فرامین کے لکھوانے میں بھی شریک ہوتا ہے اور اس کی یہ کیفیت ذہنی اور نفسیاتی ہے جو انسان کے قدیم ترین آباء و اجداد کے ساتھ تحت الشعور یا یادداشت کے نسل در نسل منتقل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

> "اس ناول (جاگے ہیں خواب میں) میں کہانی جس تھیم کے ارد گرد گھومتی ہے یا جس تھیم کا تانا بانا بننے میں مصروف ہے وہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ کہانی کا ایک حصہ زمان (مرکزی کردار، یا مرکزی تھیم) کی خواب بھری زندگی کی تحلیلِ نفسی (Psycho-Analysis) کرتا نظر آتا ہے جب کہ دوسرا حصہ زمان کے آباء و اجداد کی کہانی پر مشتمل ہے جو زمان کے نکڑ دادے نور خان سے شروع ہوتی ہے۔"[5]

اختر رضا سلیمی کا ابتدائی ادبی تعارف غزل تھی، بعد میں ان کی نظموں کی کتاب خواب دان سامنے آئی اور پھر دو ناول ان کے بھرپور ادبی قد و قامت پر مہر ثبت کرتے ہوئے سامنے آئے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت اور غزل کے رمزیہ و ایمائی اسلوب نے ناول میں بھی اپنی جلوہ فرمائی دکھائی۔ اپنے شخصی مزاج کے آئینے میں بھی وہ ایک خواب میں بسر۔ پہلے ناول کا عنوان وہ غالب کے ایک شعر سے لیتے ہیں جو ناول کی ابتدا میں بھی درج کیا گیا:

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب کا شعر اور اس سے چنا گیا عنوان ناول کے علامتی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ ناول اپنے اندر قبلِ مسیح تک کے زمانے کی تاریخ کو سمیٹے ہوئے ہے اس کے ساتھ ساتھ ہزارہ اور پوٹھوہار خطے کی فضا کو کسی اردو ناول میں ایسے انداز کے ساتھ پہلی بار کسی ناول نگار نے وضاحت سے پیش کیا۔ یہ ناول بھی اس خطے کی طرح نشیب اور فراز کے بہت سے رازوں کا امین بنتا چلا گیا ہے۔ مہاتما بدھ کے احکامات کی کھوج ہو یا سید احمد بریلوی کے ساتھیوں کا جوش و جذبہ اور انگریزوں اور سکھوں سے مقابلہ یہ سب ایک طرح کی تاریخی حقیقت بھی بن کر سامنے آتے ہیں اور حال سے اپنا ایک تعلق بھی قائم کرتے ہیں۔ ناول کا دوسرا باب "خواب کا

پس منظر " 1831ء سے شروع ہوتا اور بظاہر یوں لگتا ہے جیسے ناول کی کہانی اپنی ڈگر سے ہٹ گئی ہے لیکن جب قاری چوتھے باب میں پہنچتا ہے تو تلازمے ملنا شروع ہو جاتے ہیں اور قاری کی مسرت دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہ باب سید احمد بریلوی کی سکھوں کے خلاف جہاد کے پس منظر میں ہے، وہ خلافت قائم کرنا چاہتے تھے، اسی لیے سکھ قیادت انھیں خلیفہ کے نام سے یاد کرتی ہے اور وہ اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت شہید ہو جاتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں یہ خواب اسلامی سلطنت کے قیام کا خواب ہے۔"[6]

اختر رضا سلیمی کی کردار نگاری

کرداروں کی تخلیق کا عمل کتنا جانکاہ ہوتا ہے اس سے تخلیق کار ہی آگاہ ہوتا ہے لیکن ناقد بھی ان کرداروں کے رویوں کا مطالعہ کر کے اور ان کی تحلیلِ نفسی کے ذریعے ناول نگار کے نفسیاتی رجحانات و میلانات کی خبر لاتا ہے۔ زندہ کرداروں کی تخلیق ہی ادیب کو صنفِ سخن کی روایت میں زندہ رکھتی ہے رونہ جامد اور بے جان کرداروں کو تشکیل دینے والے ادیب بھی جلد ہی اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی تشکیل ہی عموماً مصنف کا تعارف بھی بن جاتی ہے۔ اردو ناول کی تاریخ بھی آغاز سے ہی ایسے کرداروں کی حامل رہی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اکبر اور کلیم جیسے جاندار کرداروں کے بعد امراو کا کردار اور وہاں سے ہوتے ہوئے عہدِ حاضر میں اختر رضا سلیمی کے تخلیق کیے گئے جندروئی کے کردار تک اردو ناول کی روایت ایسے بیسیوں اہم کرداروں کی ایک کہکشاں تشکیل دیتی ہے۔ زمان اور ولی خان کے جدِ امجد محض کردار نہیں ہیں، نہ ہی یہ ٹائپ ہیں بلکہ ان کے پیچھے ثقافتی معانی کی پوری کائنات تہ در تہ موجود ہے۔ یہ خوددار اور بہادر کردار ایک طرح کا 'نفسی نقش' (Psychic Imprint) ہیں جن سے سلیمی کا ذہن عبارت ہے اور اس کی فن کاری جس کے بغیر مکمل نہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ آرکی ٹائپ گویا سلیمی کے ذہن و شعور و لاشعور میں کھدا ہوا ہے یا سلیمی کی سوچ اس کے تصور میں ڈوبی ہوئی ہے۔[7] ناول کے مختلف وقوعوں کے اظہار کا مقام پہاڑی چٹان اور اس کا نظارہ بھی خود میں مکمل علامتی اظہار کا حامل ہے۔

ولی خان جندروئی کا کردار

جندر کا مرکزی کردار ولی خان جندروئی ہے جو گاؤں سے ایک میل دور ندی کنارے پانی والی چکی میں گندم پیسنے کا کام کرتا ہے اور اسے جندر کی کوک نے اپنا اسیر کیا ہوا ہے۔ یہ اس کے لیے دنیا کے نظام کے چلنے جیسا عمل ہے۔ اپنے کردار کے کسی ایک پہلو سے یہ کردار اور اس کا گندم پیسنا ہندی دیومالا کے ان عناصر سے بھی تعلق رکھتا ہے جس میں انسان کو دنیا میں گندم یا سونے میں سے کسی ایک پر اختیار دیا گیا لیکن اس کا لالچ اسے اناج کے ساتھ ساتھ مال کو بھی دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے پر ابھارتا ہے۔ ولی خان جندروئی بھی اپنے اردگرد کے لوگوں، جانوروں، منظروں، ندی کے پانیوں، آوازوں، پرندوں اور یادوں کے ذریعے سے اس عمل پر غور کرتا رہتا ہے کہ کس طرح سماج کے مظاہر رفتہ رفتہ دولت، مال یا زر کے پیمانے میں ڈھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے اپنے کام کی ایک دلی نسبت ہے جو چاہے اس کے لیے بہت افادی نہ بھی ہو اس کے باوجود بھی وہ اس کام کو چھوڑنے کے بجائے صرف اس کام کی محبت میں بھی اسے جاری رکھنے کو تیار ہے لیکن دوسری طرف معاشرہ بازار کی تہذیب میں ڈھلتا چلا جا رہا ہے جو اشیا کو بازار کی جنس کے طور پر جانچتا ہے۔ ایک چھوٹا سا گاؤں بھی کس طرح صنعتی مظاہر کا اسیر ہو کے اپنی روایات، ضروریات، ثقافت، زبان اور روزمرہ کے امور میں تبدیلی کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور اسے اس سارے عمل کا کوئی خاص دکھ یا کرب بھی نہیں ہے۔ دوسری طرف جندروئی کا کردار اناج کے ذریعے سے لوگوں کے بطن تک رسائی سے ان میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ کر کرب کا شکار تو ہے لیکن خود کو اس عمل کے بدلنے سے روکنے کی استطاعت یا خواہش نہیں پاتا۔ ولی

خان کا کردار ابتدا اسے ہی تنہائی یا اکیلے ہی فطرت کی گود میں پلنے کی روش پہ ڈال دیا گیا۔ اسے پیدا کرنے میں ماں کا اس دنیا سے کوچ کر جانا وجود کے ایک حصے کی پیدا ہوتے ہی جدائی سے تعلق رکھتا ہے۔ لڑکپن میں ہی باپ کی وفات بھی اس کی تنہائی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ لڑکپن تک باپ کے کردار کا ساتھ چلنا پدرسری معاشرے میں باپ کی میراث سے منسلک ہونے اور اس کے کام کو سیکھنے، چلانے اور آگے لے کر چلنے سے متعلق ہے۔

جمال دین کا کردار

ولی خان کے دادا کا بھائی بابا جمال دین وہ کردار ہے جو کم از کم پانچ نسلوں کی یادوں کے ماضی، حال اور مستقبل کو جانتا بھی ہے اور اسے کہانی کے انداز میں داستانوی رنگ دینے کی بھرپور استطاعت بھی رکھتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے سے ناول نگار نے فکشن کے بارے میں اپنے خیالات، اپنے سوچنے کے انداز، کہانی بُننے کے عمل اور اردو ناول نگاری کے راوی اور بیانیے پر بھی اظہارِ خیال کی راہ نکالی ہے۔ نہ صرف اردو ناول بلکہ روسی ادب کا ترجمہ اور مطالعہ بھی اس کردار کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔ یہی کردار اس ایک نسائی کردار سے تعلق کا ذریعہ بھی بنتا ہے جو جندر کی اس جنت میں حوا کا روپ دھار کے آتی ہے اور اپنے معاشرے کی پہلی اعلیٰ تعلیم تک دسترس حاصل کرنے والی لڑکی ہے۔ ان تینوں کرداروں کا کہانیوں کا پڑھنا، ان پہ گفتگو کرنا اور بعد میں اس لڑکی کا ولی خان کی شریکِ حیات بن جانا بہت اہم ہے کیونکہ اس پسندیدگی اور ساتھ زندگی گزارنے کے اختیار یا انتخاب میں بنیادی وجہ ولی خان کا ایک آزاد مرد ہونا ہے جو کسی کا پابند نہیں ہے اور اس کی زندگی گزارنے کا عمل اپنی پسند سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ کسی جبر کا نتیجہ ہے۔ یہ انسانی آزادی اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتے چلے جانے کی بھی ایک علامت ہے۔ کچھ لمحوں کے لیے آنے والی یہ عائلی زندگی پھر تنہائی کی نذر تب ہوتی ہے جب ولی خان کی بیوی بچے کی پیدائش کے عمل میں آنے کے بعد جندر کے بجائے گھر کا انتخاب کرتی ہے۔ اب ولی خان پھر جندر پہ اکیلا رہ جاتا ہے اور جندر کی کوک اس کے سونے جاگنے اور جندر کے نظام چلانے سے جڑ جاتی ہے۔ جندروئی کا کردار اپنی جگہ پہ اسی قدامت اور استقامت کے ساتھ موجود ہے جبکہ ارد گرد کی دنیا بدلتی چلی جا رہی ہے۔ یہ پیدا ہونے والا بیٹا بڑا ہو کے شہر بھی جا بستا ہے اور ماں کو بھی ساتھ لے جاتا ہے جہاں وہ اگلی دنیا کے سفر پہ روانہ ہو جاتی ہے۔ بیٹے کا باپ کے پیشے کو نہ اپنانا اور باپ دادا کے قصبے کو چھوڑ کر شہر جا بسنا صنعتی عہد کے اس جبر سے تعلق رکھتا ہے جس میں انسان صنعتی شکنجے میں جکڑتے چلے جانے کو اپنا انتخاب سمجھتا ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ یہ اسے ہانکا لگا کر گڑھے میں گرانے جیسا عمل ہے جس میں وہ گرفتار ہو کے وہی کچھ کرنے کا پابند ہو جاتا ہے جو عصری تقاضے سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ شخصی آزادی اور فطرت کی گود میں فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی روایت اور سہولت سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔

ولی خان کے کردار کی موت

اختر رضا سلیمی کے ناول جندر میں جندروئی کے روپ میں ظاہر ہونے والے ولی خان کے کردار کی موت کے بارے میں پیشین گوئی سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ پوٹھوہاری میں پن چکی کے لیے جندر کا لفظ مستعمل ہے۔ وہ اسے ہزارہ اور پوٹھوہار کی تہذیب و ثقافت اور دیہی زندگی کے اجتماعی دکھوں سکھوں کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول ایک کردار کے آخری لمحوں کی روداد ہے جو جان چکا ہے کہ یہ اس کی آخری رات ہے اور اس آخری رات میں اسے جو سوچ مسلسل گھیرے ہوئے وہ یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ جب پو پھٹے گی اور روشنی کی کرنیں دروازے سے

اندر جھانکیں گی تو پانی سر سے گزر چکا ہو گا اور میری سانسوں کا زیر و بم، جو اس وقت جندر کی کوک اور ندی کے شور سے مل کر ایک کرب آمیز سماں باندھ رہا ہے، کائنات کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو چکا ہو گا اور پیچھے صرف بہتے پانی کا شور اور جندر کی اداس کوک ہی رہ جائے گی؛ جو اس وقت تک سنائی دیتی رہے گی جب تک جندر کے پچھواڑے موجود، معدوم ہوتے راستے پر سے گزرتے ہوئے، کسی شخص کو اچانک میرا خیال نہ آجائے اور وہ یوں ہی بغیر کسی پیشگی منصوبے کے محض میرا اتا پتا کرنے، جندر کے صحن کو اس اجاڑ راستے سے ملانے والے، سات قدمی زینے پر سے اترتا ہوا جندر کے دروازے تک آجائے۔ یہ دروازہ، جسے میں رات کو سونے سے پہلے ہمیشہ اندر سے کنڈی لگا دیا کرتا تھا؛ آج اسے بند کرتے ہوئے میں نے احتیاطاً کنڈی نہیں لگائی؛ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آج میری زندگی کی آخری رات ہے اور میرے بعد اسے، کسی مانوس یا ان جانے دستک پر، اندر سے کھولنے والا کوئی نہیں ہو گا۔

میرے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہو گا؟"[8]

یہ طویل اقتباس محض تین فقروں پر مشتمل ہے جن میں سے آخری فقط دس لفظوں پر مشتمل ہے لیکن پہلے دونوں فقرے بہت طویل بھی ہیں اور اپنے اندر مکمل منظر بیان کرنے کے لیے رموزِ او قاف کے التزام کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ نہ صرف رموزِ او قاف کا جدید استعمال بلکہ املاء کے حوالے سے بھی ان دونوں ناولوں میں تخلیق کار خاصے اپ ٹو ڈیٹ دکھائی دیتے ہیں جو اردو ناولوں کے نسبتاً تن آسان تخلیق کاروں میں ایک خوش گوار حیرت سے ہمیں ہم کنار کرتے ہیں۔

ناول میں زبان کی خوبصورتی

اس ناول میں اختر رضا سلیمی جندر یعنی پانی سے چلنے والی آٹا پیسنے کی چکی کو ہزارہ اور ہر وہ دریا یا ندی کے کنارے کنارے بسنے والے لوگوں کی ہزاروں سال پر محیط ایک دوسرے سے بندھے ہونے کی تہذیب کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ گندم اور گندم کے حاصل کرنے کے مراحل سے لے کر اس کے پیسنے تک یہ معاشرے جو ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا برقی مشینوں کے آنے سے وہ کس طرح فطرت سے کٹتا چلا گیا اور اسے ایک دوسرے کی ضرورت بھی کم سے کم ہوتی چلی گئی اس سب کو ایک المیے کے طور پر ہمارے ناول نگار پیش کرتے ہیں۔ 21 ویں صدی میں لکھے جانے والے اس ناول کی زبان موجودہ دور کی اردو زبان ہے جس میں کوئی تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ مصنف نے علاقائی زبان ہندکو کے ان الفاظ کو جو اس ماحول کا حصہ ہیں اپنے بیانیے میں سمو لیا ہے کیونکہ ان الفاظ کا متبادل ہو بھی نہیں سکتا اور اگر ہو بھی تو قصے کی اصل روح اور زبان کی چاشنی میں فرق آتا ہے۔ اردو زبان کی یہی خوب صورتی ہے کہ یہ اپنے اندر ایک ثقافتی اور تہذیبی پہلو رکھتی ہے۔[9]

جندروئی کا کردار مردِ کہستانی

جندروئی کا کردار فطرت کے ساتھ مل کر مردِ کہستانی بن کر ابھرتا ہے جو فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کا فریضہ سرانجام دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف وہ پہلا کردار جس کے بارے میں خود اس پہلے کردار کو یقین ہے کہ وہ ہرگز پہلا شخص نہیں ہو گا جو اس کے مرنے کے بعد جندر والے احاطے میں اترے گا۔ جندروئی کا بیٹا راحیل اور اس کی بیوی ناول میں مرکزی قضیے کے متصادم اور مخالف فریق بن کے سامنے آتے ہیں:

"اس کی بیوی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ گاؤں کی وہ عورتیں ہوں گی جن سے ملتے ہوئے اسے ہمیشہ گھن آتی تھی لیکن اب تو اسے ان سے بغل گیر ہو کر باقاعدہ بین بھی کرنے ہوں گے اور ان کے جسموں سے آنے والی پسینے، گوبر اور نسوار کی بساند اسے کئی دن تک چین سے سونے نہیں دے گی۔"[10]

راحیل اور اس کی بیوی کا کردار

راحیل اور اس کی بیوی جن کے بارے میں ناول کا مرکزی کردار متیقن ہے کہ وہ اس موسم میں کبھی اس جگہ نہیں آسکتے علامتی اعتبار سے بنیادی قضیے کی مخالفت و مخاصمت میں گھڑے گئے ہیں۔ یہی کردار ناول کے آخر میں جندروئی تہذیب کے خاتمے کی علامت بن جائے گا جب کہ فطرت کے مقاصد کا نگہبان اس پن چکی کا آخری جندروئی اس تہذیب کی علامت ٹھہرے گا۔

بابے جمال کا کردار

بابے جمال کا کردار کئی نسلوں کے ورثے اور علمی میراث کی منتقلی کی علامت بن کے ابھرتا ہے۔ ناول نگار اس کردار کے ذریعے علاقے کی ثقافت اور تاریخ کو بھی بیان کرتا ہے نئے ادبی ورثے کے ساتھ ملا کے ادب کی لوگ ادب میں جذب جڑوں تک بھی رسائی کی راہ دکھلاتا ہے۔ یہ کردار لوک ادب کی زبانی روایت اور کہانیوں قصوں کے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کی خوب صورتیوں کو بیان کرتا ہے۔ ان علاقائی اور مقامی روایات میں سے ایک اہم روایت کو ناول نگار ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"بجو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات کی واحد مخلوق ہے جسے انسانی ٹخنوں میں دھڑکتی اس رگ کا پتا ہے سے پکڑنے سے مردہ اٹھ کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ بابا جمال دین کے بقول اگر مردے کو دفنانے کے بعد قبر پر کانٹے دار پھنگیں نہ رکھی جائیں تو آدھی رات کے وقت بجو انسانی لاش کی بو پا کر قبرستان میں داخل ہوتا ہے اور اپنے پنجوں سے قبر کھود کر اس میں اتر جاتا ہے اور لاش کو اسی تنگ سوراخ میں سے گھسیٹ کر باہر نکالتا ہے اور پھر پاؤں کی طرف سے کفن پھاڑ کر ٹخنوں میں موجود اس رگ کو پکڑ کر مردے کو اپنے ساتھ چلا کر اپنے بل میں لے جاتا ہے اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اگلے تین چار دنوں میں اسے چٹ کر جاتا ہے۔"[11]

انسان کے وجودی مسائل

اختر رضا سلیمی اپنے ناولوں میں انسان کے وجودی مسائل کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کا فن فطرت سے مل کے وقت یعنی زمان سے ہوتا ہوا حال تک آتا ہے اور اسی نتیجے تک شعوری و ارادی طور پر رہنمائی کرتا ہے کہ فطرت کے ساتھ جڑے رہنا ہی انسانی وجود کے زمان و مکان سے ماورا ہو جانے اور اس کے ساتھ تعلق کی بنیادی کلید ہے۔ جندر کے آخر میں بھی وہ مرکزی کردار کے اپنی موت کا منتظر ہونے کی وجہ پینتالیس دن سے کسی شخص کا اس علاقے کی خوراک کے سب سے اہم جزو گندم کی پسائی کے لیے نہ آنا ہے۔ ڈیڑھ ماہ کا یہ انتظار ناول کے اس مرکزی کردار کے اس خدشے کی تکمیل ہے کہ مشین نے انسان کے متبادل کے طور پہ جگہ لے لی ہے اس لیے اس کے سانس پورے ہو چکے ہیں۔

"مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر کہیں سے کوئی چونگ میسر آجائے اور میں جندر کی وہی سریلی گونج دوبارہ سن سکوں تو میرا ماس جو گزشتہ پینتالیس دنوں میں خالی گھومتے جندر کی کوک نے میری ہڈیوں سے علاحدہ کر دیا ہے، دوبارہ ہڈیوں سے جڑنا شروع ہو جائے گی اور میں دوبارہ جی اٹھنے لگوں گا لیکن اب اس قسم کی

کوئی امید بے کار ہے کہ اگر گاؤں میں لگی مشینی چکی ابھی اور اسی لمحے بھک سے اڑ جائے تو بھی رات کے اس آخری پہر میں کوئی یہاں آنے سے رہا اور ابھی کچھ دیر بعد جب پو پھٹے گی تو پانی سر سے گزر چکا ہو گا۔ "[12]

جندر اور جندر روئی کی ذات کو مرکزی حیثیت

ناول نگار اس سارے منظر نامے میں جندر اور جندر روئی کی ذات کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں اور جندر میں پیسے جانے والی چونگوں کو وقت کی اکائی کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ اس کی گونج اور کوک جو دانے ہونے یا خالی پن چکی کے چلنے سے بدلنے والی آواز ہوتی اسے انسانی جذبات کے مد و جزر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ جندر کو ہزاروی تہذیب کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کے آخری نمائندے کی موت اس خاموشی سے ہوتی ہے کہ اس کے گرویدہ ماتم کرنے کی سوچ سے بھی عاری مشینی جذبات کے مالک ہو چکے ہیں۔ محمد زیادف اور ارشد معراج نے سلیمی کے ناول میں مابعد جدید عناصر کی بازیافت کرتے ہوئے مقامیت کے مباحث کو چھیڑا ہے: مابعد جدیدیت نے کلیت پسندی کے بجائے مقامیت کو اہمیت دے کر اس گلوبلائزیشن کو چیلنج کیا ہے، اسی لیے مابعد جدیدیت کی سب سے اہم خصوصیت آفاقیت کے بجائے مقامیت پر زور ہے۔ اس تناظر میں معدوم ہوتی ہوئی ثقافت کی اہمیت اور احیا مابعد جدید تخلیق کار کا اولین مقصد ہوتا ہے۔۔۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں کے موضوعات کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہوئے تہذیب و ثقافت سے لے کر تاریخ و جغرافیہ تک مقامیت ہی کو برتا ہے۔[13] ایک چھوٹے سے گاؤں کے صنعتی عہد کے جبر کا شکار ہو جانا گلوبلائزیشن کے اس عمل کا حصہ ہے جس میں ہر خطہ ہی عالمی گاؤں کی محفل کا حصہ ہے لیکن ناول نگار نے مرکزی کردار کے ذریعے سے وجودی اہمیت کو واضح کیا اور اپنے خطے کی تہذیب، ثقافت، زبان، معاشرت اور تہذیب کے بیان سے مقامیت کے ان عناصر کو اپنے آدرش کا حصہ بنایا ہے جو اسے جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔

خلاصۂ بحث

تہذیب و ثقافت کسی خطے کے صدیوں کے اس انسانی عمل سے تعلق رکھتی ہے جسے انسان نے فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی خواہش کے نتیجے میں پروان چڑھایا۔ ہزارہ وادی اور اس کے اطراف میں اسلامی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگی صدیوں کے روابط سے تعلق رکھتی ہے جس نے یہاں ایک زمانے میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کے اسلامی سلطنت کے قیام اور خلافت کے لیے اس خطے کے مجاہدین کی آماجگاہ بن کے برطانوی استعمار سے مقابلے اور رنجیت سنگھ کی پنجاب میں حکومت کو بھی چیلنج کیا اور اس سارے خطے میں وہ مثال قائم کی جسے اسلامی خلافت کے احیا کی خواہش رکھنے والے انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے دونوں ناولوں " جاگے ہیں خواب میں" اور "جندر" میں اس مقامی ثقافت اور تہذیب کے عناصر میں دینِ فطرت اسلام کے سرایت کرنے اور لوک زندگی کا حصہ بننے کو اس خطے کی روح کا اٹوٹ حصہ ظاہر کیا ہے جسے صنعتی عہد کی بھاگ دوڑ نے گدلا کے رکھ دیا۔ وہ مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ اپنے کرداروں اور واقعات کے ذریعے سے بہت موثر طریقے سے بیان کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ دونوں ناول اس کا بین ثبوت ہیں۔

References

[1] Nisār Turābī, *Jāghy hein Khawāb mein aik Mukhtaṣar Tāssur Imtiraj no. 4* (Karachi: University of Karachi, Dec.2015), 154.

[2] Khālid Meḥmood Sāmtiya, *Khawāb, Ijtmai Lāsha'oor aur Akhtar Razā Saleemī* (Rawalpindī: Romail House of Publications, 2020), 11.
[3] Dr. Darwesh, Ṣalāḥ al-Dīn, *Akhtar Razā Saleemī Jāghy hein Khawāb mein Chand Lughwī Jehtein* (Chand Lughawi Jehten, Quarterly Niqat, No 13, June2015), 370-371.
[4] Sāmtiya, *Khawāb, Ijtmai Lāsha'oor aur Akhtar Razā Saleemī*, 11.
[5] Qāsim Ya'qoob, *Lāsha'oor kī Nafsiātī Girhen aur Kahānī kā Jawāb*Aabshar, (Novel Sadi Number) No.7 (Miānwālī: 2017), 279.
[6] Mumtāz Ahmad Khān, *Jaagy Hain Khwab Mein: Tashkeek aur Yaqeen kī Ḥairat Angaiz Kathā*, (Novel Sadi Number) No.7 (Miānwālī: 2017), 266.
[7] Sāmtiya, *Khawāb, Ijtmai Lāsha'oor aur Akhtar Razā Saleemī*, 50.
[8] Akhtar Razā Saleemī, *Jandar* (Rawalpindī: Romail House of Publications, 2017), 7.
[9] Muhammad Ṭāriq Anṣārī and Dr. Rubinā Rafique, "Dr. Akhtar Raza Saleemi key Novel Jandar Mein Alāqāī Zubān-o-Ṣaqāfat key Asrāt". *Half Yearly Journal of Research Urdu 36*, no. 2 (Multan: BZU, 2020): 106.
[10] Saleemī, *Jandar*, 12.
[11] Saleemī, *Jandar*, 17.
[12] Saleemī, *Jandar*, 119.
[13] Muhammad Ziādaf and Dr. Arshad Meḥmood Āsif, "*Akhtar Razā Saleemī key Novels Mein Māb'ad Jadeed 'Anāsir*,". *Jahān-e-Teḥqeeq 4*, no. 3 (2021): 319-392.